(غلام گردش)

ذہانت جرم ہے!

معنی اور دلیل سے محروم شخصی رویے اب وہاں تک پہنچ چکے ہیں کہ مکمل نظام لال دائرے کے درمیان ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا ہے۔ایسی ایسی باتیں کی جارہی ہیں جس سے شک سیلاب کی طرح پھیلتا جارہا ہے۔سنجیدگی سے معاملہ فہمی کی طرف لے جانے والے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں اوراب مجھے یہ تاثر ملنے لگا ہے کہ انکی آواز بھی کمزور پڑتی جارہی ہے۔ہر شخص پریشان ہے۔ہر بندہ دوسرے سے پوچھ رہا ہے کہ اب کیا ہوگا! کیا ہونے والا ہے؟ایک دوسرے پر ذاتی حملے اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ لوگ اب پرائیویٹ ٹی وی چینلز کے غیر شائستہ ٹاک شوز دیکھنا پسند نہیں کررہے۔بگاڑ کی کئی وجوہات ہیں۔مگر بنیادی وجہ صرف ایک ہے۔ہر طرف نظر دوڑائیے۔آپ کو میرٹ کا قتل عام نظر آئیگا۔کہیں سیاسی حکمرانوں اور کہیں سرکاری بابوؤں کے ہاتھوں۔کہاں گیا وہ نعرہ!Good Goverenence یا اہلیت والے لوگوں کو آگے لانے کا خواب۔

معاشرہ ہر سطح پر شدید تقسیم کا شکار ہے۔یہ انتشار اوپر کی سطح سے نیچے تک ہر جانب محسوس ہورہا ہے۔میں ایک عجیب مستحکم رویہ دیکھ رہا ہوں۔یہ رویہ آپ کو ہر جانب نظر آئیگا۔یہ خوفناک بھی ہے اور یہ آہستہ آہستہ ہمیں بانجھ کررہا ہے۔یہ نکتہ ہے کہ ہمارا نظام لائق آدمی کو برداشت نہیں کرپارہا۔اوسط درجے سے بھی کم ذہین لوگ اب آپ کو ہر جانب رموز سرکار چلاتے نظر آئینگے۔لائق شخص اب سماجی،سیاسی،سرکاری اور نجی شعبے سے رد کیا جاچکا ہے۔یہ بنیاد ہے جس سے تنگ آکر ہمارے ذہین لوگوں کی اکثریت ملک چھوڑ چکی ہے۔مگر اس سکہ کا ایک دوسرا رخ بھی موجود ہے،جو اتنا ہی اہم ہے۔اگر بدقسمتی سے کوئی لائق شخص اس ملک کے سرکاری نظام میں کسی وجہ سے کام کرنے پر مجبور ہے تو اُس کو یہ نظام نشان عبرت بنادیتا ہے۔وہ شخص اپنی جبلت سے مجبور ہوکر ہر مسئلہ کا کوئی حل بتانے یا سمجھانے کی کوشش کرے گا۔اور یہی اسکی سب سے بڑی غلطی گردانی جائیگی۔کیونکہ ہم لوگ مسائل پیدا کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔انکو حل نہ کرنا اب ہماری قومی عادت ہے۔

آپ سیاسی نظام کو پرکھیے۔دانستہ طور پر ایسے لوگوں کو اس اہم ترین شعبے میں آگے لایا جاتا ہے جو کسی بھی وزیراعلیٰ یا وزیراعظم کے سامنے سوائے تعریف کے کوئی اور بات کہنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔وہ صرف انکی ہاں میں ہاں ملائیں گے۔وہ ہر مقام پر اپنی بے عزتی کروا کر بھی خاموش رہیں گے۔اور اگر کوئی سیاسی کارکن یا ممبر خدانخواستہ ایسی بات کہہ دیں جو دربار شاہی کو ناگوار گزرے تو اُس کی ہر دفتر اور اہم جگہ رسائی ناممکن بنادی جائیگی۔میں نے یہ سینکڑوں بار ہوتے دیکھا ہے۔پاکستان کی کوئی سیاسی پارٹی یا سیاسی حکومت پارلیمنٹ کے اہل ممبران کو پسند نہیں کرتی۔آپکو زبانی خطبوں اور تقاریر میں جو سنایا جائیگا۔اصل معاملات اس سے بالکل الٹ چلائے جائینگے۔اگر غلطی سے کوئی اہلیت والا ایم۔پی۔اے یا ایم۔این۔اے وزارت تک بھول کر چلا بھی گیا تو اس کے ساتھ ایسا درباری بابو لگا دیا جائیگا جو اسکی کوئی بات نہیں مانے گا۔کیونکہ اس بابو کو لگانے سے پہلے سمجھایا جائیگا کہ آپ نے اپنے محکمہ میں اپنے وزیر کی کوئی بات نہیں ماننی۔تھوڑے عرصے بعد وہ وزیر غیر موثر یا ناکام قرار پاکر فارغ کردیا جائیگا۔

تمام ملکی شعبوں میں بالکل ایک جیسا حال ہے۔ کیڈٹ کالج حسن ابدال میں 1972 میں گیا تھا۔ اور رنگزیب ونگ (ہاسٹل) میں ملتان سے تعلق رکھنے والا حامد تھوڑے عرصے میں میرا قریبی دوست بن گیا۔ اُس کے والد تعلیم کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے اور کسی سرکاری کالج کے پرنسپل تھے۔ ہم لوگ آٹھویں کلاس میں گئے تھے۔ کیا عمر ہوگی! گیارہ سال یا حد بارہ سال۔ حامد ہم سب سے زیادہ ذہین اور سوچنے والا بچہ تھا۔ وہ گیارہ سال کی عمر میں عورتوں کے حقوق پر مدلل بحث کرتا تھا۔ وہ معاشرے میں عدم مساوات کو سب کے سامنے وضاحت سے بیان کرتا تھا۔ اسکا مطالعہ آہستہ آہستہ وسیع ہوتا گیا۔ پانچ سال بعد یعنی 1977 میں ہم لوگ F.Sc میں تھے۔ اب وہ ہر نازک اور مشکل موضوع پر دلیل سے گفتگو کرتا تھا۔ وہ غلامی کے نظام کے خلاف تقریریں کرتا تھا۔ ہم دونوں حسن ابدال سے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج آئے۔ طویل عرصہ روم میٹ بھی رہے۔ اب اس کے خیالات میں بہت پختگی آ چکی تھی۔ اسکی حِس ظرافت اتنی بھرپور تھی کہ وہ اپنے ساتھ قہقہوں کا طوفان لیے پھرتا تھا۔ میڈیکل کی تعلیم اسکے لیے بچوں کا کھیل تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اتنا ذہین ہے کہ دس بارہ سال میں پاکستان کے بہترین ڈاکٹروں میں ہوگا۔ مگر اسکی ذہانت ہی اسکی سب سے بڑی دشمن نکلی۔ وہ عملی زندگی کی بابو گیری کو سمجھ ہی نہیں پایا۔ وہ ہمارے نظام کے بیکار پن کو بھی بھانپ نہیں سکا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ لاہور میں میو ہسپتال کے انتقال خون کے شعبہ میں کام کرتا تھا۔ میں نے اسے کئی بار مریضوں کیلیے خود اپنا خون عطیہ کرتے دیکھا تھا۔ اگر اس کے پاس کوئی مجبور شخص خون مانگنے آتا تھا تو وہ ہاسٹل سے زبردستی اپنے دوستوں کو لا کر انکا خون عطیہ کر کے مریض کی ضرورت پوری کر دیتا تھا۔ مگر وہ اس نظام میں بالکل فیل ہو گیا۔ وہ خدمت کرتے کرتے ایسی جرات دکھا گیا کہ اسکا اپنے شعبہ میں کام کرنا ناممکن بنا دیا گیا۔ اسکے ساتھ ایسا بُرا سلوک ہوا کہ وہ شہر چھوڑ کر واپس اپنے گھر ملتان چلا گیا۔ اس نے مجبوری میں نوکری بھی چھوڑ دی اور شائد زندگی بھی۔ آج وہ پریکٹس بھی نہیں کرتا اور جنوبی پنجاب میں ایک بیکار زندگی گزار رہا ہے۔

سرمد فیصل آباد سے میڈیکل کالج آیا تھا۔ اسکی ذہانت اور یاداشت بلا کی تھی۔ آپ یقین فرمایئے! کہ وہ میڈیکل کی مشکل ترین کتابیں ایک بار پڑھنے کے بعد ہمیں دے دیتا تھا۔ اسکے بعد وہ ہمیں کہتا تھا کہ آپ کتاب کھولیں۔ صفحہ نمبر بتائیں اور لائن کا نمبر بتائیں۔ پھر وہ ہمیں حرف بحرف کتاب میں جو لکھا ہوتا تھا، بغیر کسی غلطی اور دشواری کے بتا دیتا تھا۔ ایک دن Anatonmy کی کلاس میں پروفیسر تقیہ لیکچر دے رہیں تھیں۔ وہ اپنے مضمون پر مکمل حاوی تھیں اور تیس سال سے صرف ایک ہی مضمون پڑھا رہیں تھیں۔ لیکچر کے دوران سرمد ایک دم کھڑا ہو کر پروفیسر کو کہنے لگا کہ آپ نے ابھی جو کچھ کہا وہ غلط ہے۔ میڈم تقیہ کیلیے یہ بات بہت عجیب تھی کہ کل کا بچہ انکی غلطی نکالے۔ مگر جب انہوں نے کتاب منگوائی تو سرمد بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ پروفیسر اسے اپنے دفتر میں لے گئی اور پوچھا کہ تم نے یہ کتاب صبح صبح پڑھی ہے۔ سرمد کا جواب حیران کن تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ اس نے چار مہینے پہلے پڑھی تھی۔ اسکی یاداشت دیکھ کر پروفیسر حیران رہ گئی۔ اسکا خیال تھا کہ یہ طالبعلم جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن وہ مکمل سچ بول رہا تھا۔ M.B.B.S کرنے کے بعد وہ اسلام آباد چلا گیا۔ اس نے اپنی ذاتی زندگی میں کچھ ایسے عجیب فیصلے کر لیے جو ہمارے معاشرہ میں پسند نہیں کیے جاتے۔ اسے شخصی بہادرانہ فیصلوں کی وہ سزا ملی جو آج تک ختم نہیں ہو پائی۔ وہ دل برداشتہ ہو کر لاہور میں ایک ہسپتال میں عام سی نوکری کر رہا ہے۔ وہ پرائیویٹ پریکٹس نہیں

کرتا۔اگر میں یہ عرض کروں کہ وہ عملاً میڈیکل کی فیلڈ کو چھوڑ چکا ہے تو بالکل غلط نہ ہوگا۔ہم نے ایک بہترین دماغ ضائع کر دیا۔

میں آج سے سترہ سال پہلے بہاپور تعینات تھا۔مرتضٰی بیگ برلاس جو ایک پایہ کے شاعر بھی تھے، بہاپور کے کمشنر تھے۔وہ ایک علم دوست انسان تھے۔ہم دونوں نے بہاپور کے سرکٹ ہاؤس میں تصویروں کی ایک نمائش کروانے کا فیصلہ کیا۔میں نے شہر میں مصور تلاش کرنے شروع کر دیے۔بتایا گیا کہ نیویارک سے فائن آرٹس میں ماسٹرز کرنے کے بعد ایک نوجوان مصور یہاں رہتا ہے۔اسکا نام محمد علی تھا۔میں اسکے گھر گیا اور اسے اپنی بنائی ہوئی پینٹنگز دکھانے کیلیے کہا۔اسکا فن مصوری پر عبور دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔وہ لاہور N.C.A کے بعد نیویارک کے بہترین آرٹس کالج کا فارغ التحصیل تھا۔میں نے اسے نمائش کیلیے درخواست کی تو وہ پریشان سا ہوگیا۔اس نے بتایا کہ بہاپور میں تو کبھی اسکی تصویروں کی نمائش نہیں ہوئی۔ہم سب نے ملکر محمد علی کی تصاویر کی نمائش سرکٹ ہاؤس بہاپور میں منعقد کی۔سینکڑوں آدمی اسکی تصویریں دیکھنے آئے۔اسکی تمام تصویریں فروخت ہوگئیں۔وہ حیرت زدہ تھا کہ اسکی پینٹنگز بھی بک سکتی ہیں۔مگر وہ ایک مصور تھا۔صرف اچھا مصور۔وہ اپنے فن کو مارکیٹ کرنا نہیں جانتا تھا۔بلکہ وہ مارکیٹنگ سے بالکل نا آشنا تھا۔اسے یہ خیال چھو کر نہیں نکلا تھا کہ اسکی تصویریں اس قابل ہیں کہ لوگ اسے دیکھ کر متاثر ہونگیں۔یہ شائد اسکی پہلی اور آخری نمائش تھی۔وہ بہترین مصور ہونے کے باوجود مکمل گوشہ نشین تھا۔لوگوں سے ملنا جلنا از حد کم تھا۔یہ گوشہ نشینی شائد اب تک قائم ہے۔بہت کم لوگوں کو محمد علی کے نام کا علم ہے۔اسکے فن کی قدر کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔اسے احساس نہیں تھا کہ ہر شعبے کی طرح آرٹ میں بھی اسے لابنگ کی ضرورت ہے۔وہ تو بس ایک سادہ سا مصور تھا۔اپنے گھر اور اپنے کمرے تک محدود۔اس جیسے بڑے مصور کا نام تمام لوگوں کیلیے ہمیشہ اجنبی رہیگا۔وہ اس نظام کو پہچاننے میں ناکام رہا اور اب مکمل ناکام زندگی گزار رہا ہے۔

میں جب لائق لوگوں کو ملتا ہوں تو ایک افسوس سا ہوتا ہے۔ان میں سے اکثر کی کہانی تقریباً ایک جیسی ہے۔وہ سب اس نظام میں پورے نہیں اترتے۔شائد ان میں سے اکثر اس نظام کو سمجھ ہی نہیں پاتے۔ہر شعبے میں ایک جیسی داستانیں ہیں۔انکی اکثریت ناکام اور کسی نہ کسی مسئلہ کا شکار ہے۔میں تو اب بچوں کے والدین کو کہتا ہوں کہ اپنے بچوں کیلیے ذہانت اور لیاقت کی دعا نہ مانگیں!انہیں اگر اس معاشرے میں کامیاب بنانا ہے تو بچپن سے انہیں جھوٹ بولنا سکھائیں!انہیں دوسروں کی محنت کا ثمر اپنے حساب میں ڈالنا سکھائیں!انہیں بتائیں کہ بغیر محنت کے ترقی کیسے کی جاسکتی ہے!کیونکہ اگر وہ خدانخواستہ ذہین ہوئے تو جلد کسی مسئلہ کا شکار ہو جائینگے۔کوئی منفی رویہ کا بابو یا کوئی اوسط درجے کا موروثی سیاسی حاکم انکی صلاحیتوں کو انکا بوجھ ثابت کر دیگا۔اسے ناکام قرار دیا جائیگا۔اپنے بچوں کو بتائیے کہ اس نظام میں ذہانت سب سے بڑا جرم ہے!

راؤ منظر حیات

Dated:04-05-2014